مناجات و استغفار

آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی

استغفار: توبہ انسان کو حقارت اور ذلت سے نجات بخشتی ہے۔ توبہ دلوں کو پاک کرتی ہے۔ دل یعنی جان یعنی روح یعنی حقیقت انسان۔ دل نہایت نورانی شئ ہے۔ ہر انسان نورانی ہوتا ہے، حتی کہ اگر انسان کا خدا سے رابطہ منقطع ہو جائے تب بھی اس کی ذات اور اس کے جوہر میں نور باقی رہتا ہے۔ صرف ہوتا یہ ہے کہ گناہوں اور ہوا و ہوس کی بنا پر دل غبار آلودہ ہو جاتا ہے۔ توبہ اس غبار کو صاف کر کے دل کو نورانیت بخشتی ہے۔

توبہ یعنی طلب مغفرت اور گناہوں سے استغفار۔ توبہ اگر اپنے حقیقی مفہوم کے ساتھ کی جائے تو انسان کے اوپر برکات الٰہی کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ گناہ ہمارے اور ہمارے پروردگار کے درمیان حجاب کا کام کرتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے اوپر سارے الٰہی دروازے بند ہو جاتے ہیں، نہ رحمت الٰہی نازل ہوتی ہے نہ ہدایت الٰہی، نہ توفیق الٰہی حاصل ہوتی ہے اور نہ فضل خدا۔ توبہ اس حجاب کو ختم کرنے کا باعث ہوتی ہے اور نتیجۃً رحمت و فضل خدا کا دروازہ ہمارے اوپر کھل جاتا ہے۔ یہ ہیں توبہ کے فائدے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر توبہ کے لئے کبھی دنیاوی اور کبھی اخروی فوائد شمار کرائے گئے ہیں۔ مثلاً: ''و ان استغفروا ربکم ثم توبوا الیہ۔۔ یرسل السماء علیکم مدراراً۔''

توبہ یعنی خدا کی طرف بازگشت۔ یہ ایک اہم ترین نعمت الٰہی ہے۔ خدا نے اپنے بندوں کے لئے باب توبہ کھول دیا ہے تا کہ اس کے بندے راہ کمال وسعادت میں پیش قدمی کرتے رہیں اور گناہ اس راہ میں مانع نہ ہو سکیں، کیونکہ گناہ انسان کو اس کے اعلیٰ مقام سے پستی میں لا کھڑا کرتا ہے۔ ہر گناہ روح انسان اور معنویت انسان پر ایک ضرب کی مانند ہوتا ہے جس سے روح کی شفافیت مکدر ہو جاتی ہے۔ گناہ کے ذریعے انسان وحیوانات کے درمیان پایا جانے والا فرق ختم ہو جاتا ہے۔

معنوی جنبہ کے علاوہ گناہ انسان کی زندگی میں دوسری بہت سی رکاوٹیں بھی کھڑی کر دیتا ہے۔ نہ جانے کتنی کامیابیاں گناہوں کی انجام دہی کی وجہ سے ناکامیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ یہ سب صرف زبانی یا تعبدی باتیں نہیں ہیں بلکہ انہیں علمی، فلسفی اور نفسیاتی طور پر ثابت کیا جا چکا ہے۔ مثال کے طور پر جنگ احد میں چند مسلمانوں کی کوتاہی اور تقصیر کی بنا پر فتح اوّلیہ، شکست میں تبدیل ہوگئی تھی یعنی مسلمان پہلے مرحلہ میں فتح حاصل کر چکے تھے لیکن ان چند لوگوں کی بنا پر جنہیں رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہاڑ کے دروں میں معمور کیا تھا اور انھوں نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی کی، مسلمان مشکلات کا شکار ہو گئے تھے۔

رسول اسلامؐ نے حکم دیا تھا کہ مقررہ جگہوں سے مسلمانوں کی حفاظت کریں لیکن یہ لوگ مال غنیمت کے لالچ میں اپنی اپنی کمین گاہوں کو چھوڑ کر میدان میں آگئے اور دشمن نے موقع غنیمت سمجھ کر مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔

سورہ آل عمران میں تقریباً دس یا بارہ آیتیں اسی شکست سے متعلق ہیں۔ چونکہ مسلمان روحانی اعتبار سے نہایت تلاطم اور کشمکش کا شکار تھے لہٰذا یہ شکست ان پر بے حد ناگوار گزری تھی۔ قرآنی آیتیں جہاں ان کے اطمینان قلبی کا باعث ہوتی تھیں وہیں ان کی ہدایت بھی کرتی جاتی تھیں۔ ساتھ ہی انہیں یہ بھی باور کراتی جاتی تھیں کہ اس شکست کی وجہ کیا تھی: ''اِنّ الذینَ تَوَلّوا مِنکم یومَ الْتَقی الْجَمْعان اِنَّما اسْتَزَلّھُم الشَّیطان بِبَعضِ ذُنُوبھم'' یعنی تم نے دیکھا کہ تم میں سے بعض افراد نے دشمن کو پشت دکھا دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمہیں شکست ہو گئی۔ یہ لوگ پہلے ہی سے ایسا کرنے کے لئے آمادہ ہو چکے تھے۔ ان لوگوں کو ان کاموں کی بنا پر جو یہ پہلے بھی انجام دے چکے تھے، شیطان نے باآسانی صراط مستقیم سے منحرف کر دیا یعنی انجام شدہ گناہوں نے اپنا اثر میدان جنگ میں دکھایا۔

اسی مذکورہ سورہ میں ایک دوسری آیت ایک دوسرے انداز سے اسی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ قرآن کریم درحقیقت کہنا یہ چاہتا ہے کہ اگر تم جنگ احد میں شکست کھا گئے تو یہ کوئی تعجب وحیرانی کی بات نہیں ہے، کیونکہ یہ سب زندگی کے معمولات ہیں۔ تم سے پہلے بھی ایسا ہوتا آیا ہے: ''وَ کَاَیِّنْ مِنْ نَبی قَاتَلَ مَعه رِبِّیُونَ کَثیرٌ فَمَا وَ ھَنوا لِمَا اَصَابَھُمْ فِی سَبِیْلِ اللہِ وَ مَا ضَعُفُوْا وَ مَا اسْتَکَانُوْا'' قرآن مسلمانوں سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے کہ آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم سے پہلے بھی خدا کے نبیوں کو میدان جنگ میں مشکلات وشکست کا سامنا کرنا پڑتا تھا، لیکن وہ تو ہراساں وپریشاں نہیں ہوتے تھے۔ اس کے بعد فرماتا ہے: ''وَمَاکَانَ قَوْلھم اِلّا اَن قَالُوْا رَبّنا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافنا فِی اَمْرِنَا'' یعنی گزشتہ زمانوں میں جب اصحاب انبیاء کے حوالی (حالات) مشکلات ومسائل کا شکار ہوتے تھے تو پروردگار کی بارگاہ میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھا کر کہتے تھے: ''رَبّنا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافنا فِی اَمْرِنَا'' پروردگار ہمارے گناہوں اور ہمارے ذریعے کی گئی زیادتیوں اور غفلتوں کو معاف فرما۔

یہیں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مشکلات ومسائل ہمارے ذریعے انجام دیے گئے گناہوں ہی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اپنے پروردگار کے ذریعے نازل کی گئی اہم ترین نعمت یعنی مغفرت سے استفادہ کریں۔ خداوندعالم نے فرمایا ہے کہ اگر تم نے کوئی قبیح فعل انجام دیا اور اس پر بعد میں پشیمان ہوئے تو تمہارے لئے استغفار اور توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ گناہ کی مثال کسی بیماری یا علالت کی سی ہے۔ انسان بیماری سے بہت کم محفوظ رہ پاتا ہے۔ گناہ بھی ایک مرض کی طرح ہے۔ اگر انسان اس مرض کا علاج کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ باب توبہ واستغفار کی طرف آئے۔ اگر انسان اس طرف آ گیا تو خداوندعالم اتنا غفار ہے کہ اس گنہگار انسان کو بخش دے گا۔

صحیفہ سجادیہ کی ۴۵ ویں دعا میں امام سجادؑ خدا کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں: ''اَنْتَ الَّذِیْ فَتَحتَ لِعِبَادِکَ بَاباً اِلیٰ عَفْوِکَ'' یعنی تو ہی ہے جس نے اپنے بندوں کی طرف عفو ومغفرت کا دروازہ کھول رکھا ہے۔ ''وَسمّیته التوبه'' جس کا نام تو نے باب توبہ رکھا ہے۔ ''وجعلت علی ذالک الباب دلیلاً من وحیک لئلا یضلّوا عنه'' قرآن ووحی سے ایک راہنما بھی اس دروازے پر قرار دے رکھا ہے تا کہ تیرے بندے اس سفر میں منزل سے نہ بھٹک جائیں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں: ''فما عذر من اغفل دخول ذالک المنزل بعد فتح الباب لاقامة الدلیل'' یعنی اب اس کے بعد انسان کے لئے کیا دلیل بچتی ہے کہ اس باب توبہ اور مغفرت الٰہی سے فیضیاب نہ ہو۔

راہ مغفرت الٰہی یعنی استغفار

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث منقول ہے کہ آپؐ فرماتے ہیں: ''انّ اللّٰہ تعالیٰ یغفر للمذنبین الا من لا یرید ان یغفر له'' یعنی خداوند عالم گناہگاروں کے گناہوں کو بخش دیتا ہے مگر ان گناہگاروں کے علاوہ جن کو خدا بخشنا نہیں چاہتا؟ ''قال من لا یستغفر'' یعنی وہ جو استغفار نہیں کرتا۔ پس استغفار باب توبہ ومغفرت کی چابی ہے۔ استغفار کے ذریعے ہی مغفرت الٰہی کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔

غفلت استغفار کی راہ میں پہلی رکاوٹ ہے

اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس نعمت الٰہی یعنی استغفار تک دسترسی حاصل کریں تو ضروری ہے کہ دو صفتوں کو خود سے دور کریں۔ پہلی غفلت و بے توجہی اور دوسری غرور و تکبر۔

غفلت یعنی یہ کہ انسان اصلاً متوجہ ہی نہ ہو کہ اس سے گناہ سرزد ہو رہا ہے۔ ایسے بہت سے افراد پائے جاتے ہیں جو گناہ پر گناہ انجام دیتے جاتے ہیں اور انھیں اپنے اس قبیح فعل کا احساس تک نہیں ہوتا۔ دروغ، غیبت، الزام تراشی وغیرہ اسی طرح کے گناہ ہیں۔ بعض افراد ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اگر انھیں متوجہ بھی کرایا جائے تو تمسخرانہ انداز میں قہقہہ بھی لگاتے ہیں۔ گناہ؟ گناہ یعنی کیا؟ ایسے افراد اصلاً ثواب وعذاب کے ذرہ برابر بھی معتقد نہیں ہوتے۔ بعض دوسرے ثواب وعذاب کے معتقد تو ہوتے ہیں لیکن مکمل طور پر غفلت اور بے توجہی کے اس قدر شکار ہوتے ہیں کہ اپنی ذات سے صادر شدہ فعل کا احساس بھی نہیں کر پاتے۔ اگر ہم اپنی روزمرہ زندگی میں ذرا سا جھانکنے کی کوشش کریں تو بآسانی واضح ہو جائے گا کہ ہماری زندگی بھی کم وبیش ایسے ہی حالات سے دوچار ہوتی ہے۔ غفلت ایک بہتر خطرناک شئے ہے۔ شاید انسان کے لئے غفلت سے بڑا دشمن اور خطرناک شئے کوئی نہ ہو۔ غافل انسان کسی بھی قیمت پر استغفار نہیں کرتا ہے اس کی ساری زندگی گناہوں میں بسر ہو جاتی ہے اور اس کو احساس تک نہیں ہو پاتا، فقط خواب غفلت کا شکار ہو کر رہ جاتا اور بس۔ قرآن کریم نے غفلت کے مدمقابل تقویٰ کو پیش کیا ہے۔ تقویٰ یعنی ہمیشہ اور ہر حال میں متوجہ رہنا۔ غافل شخص سینکڑوں گناہ کرنے کے بعد بھی اپنے گناہ کی طرف متوجہ نہیں ہو پاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں متقی وپرہیزگار شخص ہے، جہاں چھوٹا سا گناہ اس سے سرزد ہوا فوراً اپنے گناہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور جلد از جلد اس کی

تلافی کی فکر میں مشغول ہوجاتا ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے: ''اِنَّ الَّذین اتَّقَوْا اِذَا مَسّهم طائفٌ مِن الشَّیطانِ تَذَکَّرُوا'' اگر شیطان متقی افراد کے پاس سے گزر بھی جاتا ہے تو یہ لوگ فوراً متوجہ ہوجاتے ہیں۔ ''فَاِذاهُم مُبصرون'' ایسے ہی لوگ بابصیرت ہوتے ہیں۔

غرور وتکبر راہ استغفار میں دوسری رکاوٹ ہے

انسان جہاں ذرا سا کوئی چھوٹا سا کام انجام دے لیتا ہے فوراً مغرور ہوجاتا ہے۔ صحیفہ سجادیہ کی ۴۶ویں دعا میں ایک جملہ ہے: ''والشقا الاشقاء لمن اغتربک'' یعنی شقی ترین شخص وہ ہے جو تیرے سامنے غرور وتکبر سے پیش آئے۔ بعض افراد ایسے ہوتے ہیں جہاں کوئی کار خیر انجام دیا، فوراً یہ تصور کر لیتے ہیں کہ ہم نے خدا سے اپنا حساب بے باق کر دیا۔ اب ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ یہ جملہ زبان تک نہ آئے لیکن دل میں تو بارہا آتا ہے اور یہی غرور ہے۔

خدا نے اگر ہمارے لئے باب توبہ فراہم کر دیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ گناہوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ کبھی کبھی یہی گناہ انسان کے وجود حقیقی کو بھی ضائع کر دیتے ہیں اور اس کو حیات انسانی کے عالی مراتب سے ایک پست ترین حیوان میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

ضروری نہیں ہے کہ انسان ایک مدت تک گناہوں میں غرق رہے تب ہی گناہوں کا احساس کرسکتا ہے بلکہ گناہ، گناہ ہے خواہ ایک گناہ ہو یا گناہوں کا انبار۔ گناہ کو قطعاً حقیر نہیں سمجھنا چاہئے۔ روایت میں ''استحقار الذنوب'' کے عنوان سے ایک باب ہے جس کے تحت گناہوں کو حقیر فرض کرنے کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ خدا کے مغفرت کرنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ گناہوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے لہٰذا وہ معاف کرے گا بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اس کے ذریعے خدا تک واپس آسکتا ہے اور خدا تک برگشت (رجوع) نہایت اہم ہے کہ روایات میں جس کے لئے نہایت تاکید کی گئی ہے۔

بہر حال حقیقتاً وہی استغفار قابل ستائش ہے جو حقیقی اور دل کی گہرائیوں سے ہو۔ زبان سے توبہ اور استغفار کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔ استغفار کی شرط یہ ہے کہ انسان اپنے گناہ پر شرمندہ ہو اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا قوی ارادہ رکھتا ہو۔ روایت میں وارد ہوا ہے: ''من استغفره بلسانه و لم یندم بقلبه فقد استحضری بنفسه'' یعنی جو شخص زبان سے استغفار کرے اور دل سے شرمندہ اور نادم نہ ہو ایسا شخص درحقیقت اپنے نفس کی تضحیک کرتا ہے۔ یہ استغفار نہیں ہے۔ استغفار سے مراد یہ ہے کہ انسان واقعی خداوندعالم کی طرف برگشت کرے اور اس کی بارگاہ میں دعا کرے کہ وہ اس کے گناہوں کو بخش دے۔

دعا ایمان کو قوی اور الٰہی وعدوں کو پورا کرتی ہے

دعا انسان کو خدا سے نزدیک کرتی ہے۔ معارف دینی کو انسان کے دل میں اثر انداز اور قائم رکھتی ہے۔ دعا ایمان کو قوی کرتی ہے۔ یعنی دعا کئی زاویوں سے برکتوں اور رحمتوں کی حامل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں بارہا دعا اور بندگان صالح کے ذریعے کی گئی دعاؤں سے

متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ انبیائے الٰہی مسائل ومشکلات کے وقت خدا کی بارگاہ میں دعا کرتے تھے، خدا سے مدد کی التماس کرتے تھے: ''فَدعا ربه انّی مغلوبٌ فانْتَصِر'' جو حضرت نوحؑ سے منقول شدہ دعا ہے یا حضرت موسیٰ کی زبانی قرآن فرماتا ہے : ''فدعا ربه اِنّ هٰولاءِ قوم مُجرِمون''۔

قرآن کریم میں خداوند عالم نے متعدد آیتوں میں دعاؤں کی قبولیت اور استجابت کا وعدہ فرمایا ہے مثلاً: ''وَقالَ رَبُّکم اَدْعُوْنی استَجِب لکُم'' یعنی تمہارے پروردگار نے فرمایا ہے کہ مجھ سے دعا مانگو میں تمہاری دعاؤں کو مستجاب کروں گا۔ اسی طرح ایک دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے: ''واسئلوا اللّٰہ مِن فَضْلِه انّ اللّٰہ بِکُلِّ شَئی علیماً'' یعنی اگرچہ خدا وند عالم ہے اور ہماری حاجتوں سے آگاہ بھی ہے مگر اس کے باوجود تم خدا سے طلب کرو۔ دعائے ابوحمزہ ثمالی میں امام سجادؑ اسی طرف اشارہ فرماتے ہیں: ''وَلَیس من صفائک یا سیدی ان تامر باموال وتمنع العطیة'' پروردگار تیری یہ صفت نہیں ہے کہ اپنے بندوں کو طلب کرنے کا حکم دے اور ان کے طلب کرنے پر انہیں عطا نہ کرے یعنی خدا کے کرم اور اس کی قدرت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر وہ کہتا ہے کہ مجھ سے طلب کرو تو درحقیقت اس نے ارادہ کرلیا ہے کہ استجابت بھی کرے۔ ''وَاِذا سأَلکَ عِبادِی عنّی فَاِنّی قَریب اُجیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذا دَعانِ'' یعنی جب بھی میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو اے پیغمبرؐ آپ کہہ دیجئے کہ میں ان کے قریب ہی ہوں ان کی دعاؤں کو سنتا اور استجاب کرتا ہوں۔ اگر کوئی شخص خدا سے کچھ طلب کرتا ہے تو فوراً اس کو حاصل ہوجاتا ہے: بِکُل مسئلة مِنک سمع حاضر و جواب عتید'' یہ خدا کا قطعی اور سچا وعدہ ہے یعنی خدا ہر طلب ودعا کا جواب دیتا ہے لیکن اس وعدے کے ساتھ کچھ شرائط بھی ہیں جن میں سے ایک عمل صالح ہے: ''مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِه وَمَنْ اَسَاءَ فَعَلَیه''۔ قرآن مجید میں خدا نے اپنے بندوں سے جا بجا وعدے فرمائے ہیں۔ مثلاً: ''اِنّا لا نُضِیع اَجر من اَحْسن عملاً'' یعنی جو شخص کار خیر انجام دیتا ہے خدا اس کی جزا اور اجر کو ضائع نہیں کرتا ہے۔ ایک جگہ فرماتا ہے: ''مَنْ کَانَ یُرید العَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِیهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ یُرِیْد'' یعنی اگر کوئی انسان دنیا کو اپنا ہدف بنالے تو ہم اس کے ہدف تک رسائی میں اس کی مدد کرتے ہیں لیکن کب؟ جب وہ کوشش کرے، جستجو کرے، اقدام کرے اور آگے بڑھے۔ اس کے بعد فرماتا ہے: وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرةَ وَسَعیٰ لَهَا سَعْیَها وَهُوَ مُؤْمِن فَاُولٰئِکَ کَانَ سَعْیُهُمْ مَشْکُوراً۔۔۔۔۔ هٰؤُلَاءِ وَهٰؤُلَاءِ'' اس آیت میں فرماتا ہے کہ جو لوگ آخرت کی خواہش کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں سعی وکوشش کرتے ہیں، ہم ان کی بھی مدد کرتے ہیں۔

ایک آیت میں دنیا کا تذکرہ ہے اور دوسری میں آخرت کا اور دونوں میں شرط یہ ہے کہ سعی وکوشش کی جائے۔ اگر انسان سعی وکوشش کرے تو خداوند عالم یقینا اسے اس کے مقصد تک پہنچاتا ہے۔ یہ سنت الٰہی ہے۔ خدا کسی کی بھی زحمتوں اور کوششوں کو رائیگاں نہیں جانے دیتا۔

خداوندعالم ایک دوسری آیت میں یوں وعدہ فرماتا ہے : وَعَدَ اللہُ الَّذینَ اٰمَنُوا مِنکُم وَعَمِلوا الصالحاتِ لیستَخلِفَنّھُم فِی الارضِ کَمَا یَستَخلف الّذین مِنْ قَبلِھِم'' کوئی بھی قوم اگر عمل صالح انجام دے تو خدا اس قوم کو زمین پر خلیفہ بنا دے گا ساری زمین کی قدرت اس قوم کے ہاتھ میں ہوگی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ایمان کے ساتھ ساتھ عمل صالح بھی ہو ورنہ فقط ایمان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ فقط ایمان سے کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ ایک دیگر آیت کریمہ میں خداوندعالم وعدہ فرما رہا ہے: ''وَالَّذِینَ جَاھَدُوْا فینا لَنَھدینھم سبلنا'' یعنی اگر کوئی راہ خدا میں قدم اٹھائے تو خدا یقیناً اس کی راہنمائی کرے گا۔

البتہ ضروری نہیں ہے کہ دعا ہمیشہ معجزاتی طور پر قوانین الٰہی کو توڑتی ہوئی مستجاب ہو بلکہ دعا کا خاصہ ہے کہ دعا قوانین طبیعی (Physical laws/laws of Nature) کے دائرے میں قبول ہوتی ہے۔ وعدۂ خدا حق ہے لیکن یہ وعدہ بھی حق ہے کہ اگر انسان اپنے ہدف تک رسائی کے لئے عملی اقدام نہ کرے اور فقط بارگاہ الٰہی میں دعا کرتا رہے تو دعا قبول نہیں ہوگی۔ ہوسکتا ہے کسی اور وجہ سے مستجاب ہوجائے لیکن استجابت کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ قوانین طبیعی کے خلاف دعا کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دعا قوانین طبیعی کی مخالفت کے باوجود بھی قبول ہوجاتی ہے۔ لیکن ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے۔ جب دعا دل کی گہرائیوں اور پوری توجہ کے ساتھ کی جائے اور اگر ایسی دعا میں عملی اقدام بھی شامل ہوجائے تو دعا کی استجابت کے امکانات نہایت روشن ہوجاتے ہیں۔ ساتھ ہی اگر قدرت خدا سے مایوس نہ ہوتے ہوئے مستقل دعا کی جاتی رہے تو بھی قبولیت دعا قوی ہوجاتی ہے۔ لہٰذا اگر بار بار دعا کرنے پر بھی کوئی حاجت پوری نہ ہو تو مایوس نہیں ہونا چاہئے مخصوصاً ملک وقوم سے متعلق مسائل میں۔ جس وقت فرعون کی ظالمانہ اور استکباری حکومت میں موسیٰؑ متولد ہوئے تو آپ کی والدہ گرامی نہایت شش وپنج میں مبتلا تھیں کیوں کہ یہ واضح اور مسلم تھا کہ اس ملک میں پیدا ہونے والا ہر لڑکا قتل کر دیا جائے گا۔ اگر حضرت موسیٰؑ کی جگہ کوئی لڑکی پیدا ہوئی ہوتی تو آپ کی والدہ قطعاً پریشان نہ ہوتیں۔ بہرحال ایک طرف ماں کی محبت اور دوسری طرف فرعون کا حکم۔ اسی درمیان خدا کی جانب سے مادر موسیٰ پر وحی ہوئی: ''وَاَوْحَینَا اِلٰی اُمّ موسیٰ اَنْ اَرْضِعیه'' یعنی ہم نے مادر موسیٰ کی طرف وحی کی کہ موسیٰ کو دودھ پلائیں۔ ''فَاِذَا خِفْتَ عَلَیهِ فَاَلْقِیهِ فِی الْیَمّ'' پس اگر خطرہ محسوس کرو تو صندوق میں رکھ کر دریا کے حوالے کردو۔ خداوندعالم نے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس واقعہ کو نقل کیا ہے اور ہر بار ایک نئی ظرافت (کینواس، وسعت) اور لطافت (باریکی) کے ساتھ بیان کیا ہے۔ الغرض مادر موسیٰ نے خطرے کا احساس کرتے ہی بچے کو دریائے نیل کے حوالے کردیا۔ عجیب وغریب کیفیت ہے کہ ایک ماں اپنے نومولود بچے کو دریا کے حوالے کردے لیکن خدا نے مادر موسیٰ سے اس طرح فرمایا: ''اِنّا رادّوہُ اِلَیکَ وَجَاعِلُوہ مِنَ الْمُرسلین'' اس آیہ کریمہ میں خدا نے مادر موسیٰ سے دو وعدے فرمائے۔ پہلا

یہ کہ اس بچے کو واپس کردیں گے اور دوسرا یہ کہ اس بچے کو مرسلین میں سے قرار دیں گے۔ جب بچے کو دریا میں بہادیا گیا تو خواہر موسیٰ سے کہا: "وقالَت لِاختہ قصیه" جاؤ دیکھو کیا ہو رہا ہے! جیسے ہی صندوق فرعون کے محل کے نزدیک سے گذرا: "فالتفته آل فرعون" فرعون کے خانوادے نے صندوق باہر نکال لیا۔ اُدھر خدا نے خانوادۂ فرعون کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ اس بچے کی پرورش کرے۔ فرعون کی زوجہ، آسیہ نے کہا کہ کیا اچھا ہوگا اگر ہم اس بچے کی پرورش کرلیں: "قرۃ عینی لی ولک وحرمنا علیه المراضع" بچے نے دودھ پینے سے انکار کردیا لاکھ کوشش کی گئی مگر جناب موسیٰؑ نے دودھ نہیں پیا۔ اس درمیان خواہر موسیٰؑ آگے بڑھیں اور کہا: "هَلْ اَدُلّکم علی اهلِ بیت یکفلونه لکم" آیا میں ایسے گھرانے کی نشاندہی کروں جو تمہارے لئے اس بچی کی پرورش کرے۔

اگر خداوند عالم ارادہ کرلے تو اس طرح حالات وکوائف کو کسی کے بھی حق میں ڈھال دیتا ہے۔ خواہر موسیٰ کو اس بات پر مامور کردیا کہ وہ اپنے اندر شجاعت پیدا کریں اور فرعون کے محل تک آجائیں اور فرعوں کے سامنے اس طرح کی تجویز رکھیں۔ فرعون نے مثبت جواب دے دیا۔ خواہر موسیٰؑ گئیں اور مادر موسیٰؑ کو اپنے ساتھ لے آئیں۔ جیسے ہی موسیٰ نے اپنی ماں کی خوشبو محسوس کی، فوراً دودھ پینا شروع کردیا۔ یہ ہے قدرت خدا! فرعون اور فرعونیوں کے ذہن وگمان میں قطعاً ایسی کوئی بات پیدا نہیں ہوئی کہ یہی موسیٰؑ کی حقیقی ماں ہوسکتی ہیں۔ خدا اس طرح اپنا وعدہ پورا کرتا ہے: "فَرَدَدْنَاهُ اِلٰی اُمّه" ہم نے اس بچہ کو اس کی ماں کی طرف پلٹادیا۔ "کَیْ تَقر عینها وَلَا تَحْزَنْ" تاکہ ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک انہیں حاصل ہوجائے اور وہ غمزدہ نہ ہوں۔ "ولتعلم ان وعد اللّٰہ حق" ساتھ ہی یہ بھی جان لیں کہ خدا کا وعدہ حق رہتا ہے۔ یہ وہ وعدہ ہے جس کو خود مادر موسیٰ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا لیکن دوسرا وعدہ: "وجَاعِلوا مِنَ المُرسلین" یہ وہ وعدہ تھا جو مادر موسیٰؑ سے بعثت موسیٰؑ کے متعلق کیا گیا تھا جو برسوں کے بعد محقق ہونے والا تھا۔ اس وعدہ کے تحت جناب موسیٰؑ بطور رسول مبعوث ہونے والے اور بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم وجور سے نجات دلانے والے تھے۔ تاریخی مسلمات کی رو سے یہ وعدہ بھی تقریباً چالیس سال کے بعد پورا ہوا اور جناب موسیٰ نے بنی اسرائیل کو راہ نجات کی طرف ہدایت فرمائی۔

خدا نے اپنے وعدے کو اس طرح پائے تکمیل تک پہنچایا ہے۔ خداوند عالم مسلمانوں کو فاتح وظفریاب دیکھنا چاہتا ہے لیکن کب؟ اسی وقت جب مسلمان خواب غفلت سے بیدار ہوں۔ اُٹھیں اور اس سلسلہ میں سعی کو کوشش کریں۔ وعدہ الٰہی یہ ہے کہ اگر کوئی قوم راہ خدا میں جہاد کرے اور باایمان بھی ہو تو یقینا فتح یاب ہوگی۔ "ولمّا رأی المومنونَ الاَحزاب قالوا هذا ما وعدنا اللّٰہ ورسوله وصدق اللّٰہ ورسوله" جس وقت جنگ احزاب میں قریش، سقیف، یہودیوں اور دوسرے مختلف گروہوں نے ایک ساتھ مدینے کا محاصرہ کرلیا اور مسلمانوں

(بقیہ صفحہ ۳۹ پر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔)

قرار دیا ہے۔ ارسطو نے حرکت عمومی کے وجود کو وجود محرک کی نشانی جانا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہر طرح کی حرکت محرک کی محتاج ہے، عالم مادہ میں ہر چیز متحرک نظر آتی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس کی ذات سے علاحدہ کوئی محرک ہو۔

یورپ کی علمی تحریک کے بعد علوم طبیعی کی ماہرین میں سے کچھ لوگوں نے مخصوص طرح کی دلیلیں قائم کر کے خداوند عالم کے وجود کو ثابت کرنا شروع کیا۔ مثلاً نیوٹن کہتا ہے کہ ایک دنیا کا کوئی مادہ ہرگز اس پر قادر نہیں ہے کہ رنگ برنگ کے موجودات پیدا کرے۔ یہ اختلاف وتنوع جو خلقت میں ہمارے سامنے ہے بتا رہا ہے کہ اس مادی ساز وسامان کے پیچھے کسی قدرت کا ہاتھ ہے جس نے اس مادے میں تصرف کیا ہے۔

مصنوعی دماغ کا جب اس کی مشینری تیار کر چکا تو کہنے لگا کہ ایک مصنوعی دماغ جب بغیر انسانی عقل وتدبیر کے وجود میں آنے کے قابل نہیں ہے، تو سچ مچ کا اصلی دماغ جو اس مصنوعی دماغ سے لاکھوں گنا زیادہ پیچیدہ اور پر اسرار ہے قطعاً کسی بنانے والے کا محتاج ہے۔

آیا ان واضح دلائل کے بعد جو علوم وفنون کے بانیوں نے پیش کئے ہیں، یہ کہا جا سکتا ہے کہ نوع انسانی کے درمیان خدا کے اعتقاد نیچر کی بے رحم طاقتوں سے خوف و ہراس کا نتیجہ ہے؟

آج بھی خدا پرست اہل علم جو خدا کے وجود پر ایمان راسخ رکھتے ہیں کرۂ ارض پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک مضبوط، مستحکم عقلی دلیلوں کی روشنی میں خدا کے معتقد ہیں۔ انھیں نیچر کی ظالم طاقتوں سے خوف وہراس نے خدا کے وجود کا قائل نہیں بنایا ہے۔ (جاری)

بقیہ مناجات واستغفار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

پر حملہ کر دیا تھا اس وقت خود مسلمان دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ایک گروہ مومنین پر مشتمل تھا اور دوسرا غیر مومنین پر۔ غیر مومنین کہہ رہے تھے: ''**مَاوعدنا الله ورسوله الا غروراً**'' یعنی ہم فریب کھا گئے ہیں۔ اسلام ہمارے امن وامان اور عزت کی حفاظت نہیں کر سکا۔ دوسری طرف مومنین کا گروہ تھا جو یہ کہہ رہا تھا: ''**هذاماوعدنا الله ورسوله**'' یعنی یہ وہی وعدہ ہے جو خود خدا اور اس کے رسولؐ نے ہم سے کیا تھا۔ وعدۂ خدا اور رسول اس طرح واقع ہوتا ہے: ''**انّ الّذين آمنوا يقاتلون فی سبيل الله والذين كفروا يقاتلون فی سبيل الطاغوت**'' وہ لوگ جو مومن ہوتے ہیں راہ خدا میں جہاد کرتے ہیں اور وہ لوگ جو ایمان نہیں رکھتے راہ طاغوت میں جہاد کرتے ہیں۔ اگر مسلمان میدان جنگ میں ڈٹا رہے اور خدا کی قدرت سے مایوس نہ ہو تو یقیناً فتح اسی کی ہوگی لیکن اگر مایوس اور پسپا ہو گیا تو وعدۂ خدا بھی بہر حال پورا نہیں ہوگا۔ پس اگر دشمن حملہ کردے تو تعجب کا مقام نہیں ہے بلکہ یہ تو وعدۂ الٰہی ہے جو پورا ہو رہا ہے: ''**هذاماوعدنا الله ورسوله وصدق الله ورسوله ما زادهم الا ايماناً وتسليماً**''۔

★★★